الٹی قبر

عائشہ تو یہ چاہتی تھی کہ زمین پھٹ پڑے اور وہ زمین میں ہمیشہ کے لئے سما جائے۔ مگر ہوائی جہاز عائشہ کو زمین سے بہت اوپر لے اڑا۔ عائشہ زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھی تھی، اس لئے جیسے ہی ہوائی جہاز کٹھمنڈو کے ہوائی اڈے سے اڑا تو گھبرا کر چیخنے چلانے لگی۔ دوایئر ہوسٹیز دوڑ کر اس کے پاس گئیں اور اسے سمجھانے اور تسلی دینے لگیں۔ مگر عائشہ کا ہم سفر بنگالی جوان نور المومن اپنے مخصوص بنگلہ آمیز اردو لہجے میں ایر ہوسٹسوں سے بولا۔ ''آپ تکلیف نہ کیجئے بی بی لوگ۔ میں اسے ڈھاکہ سے کٹھمنڈو تک جگہ جگہ خودکشی سے بچا کر لایا ہوں۔ اب یہ ہوائی جہاز میں آکر پھر نخرہ کر رہی ہے۔ آپ ہٹ جائیں، میں اس کو ایک ہی بات میں چُپ کرادوں گا۔'' یہ کہہ کر نور المومن نے بنگلہ زبان میں واقعی صرف ایک ہی جملہ ایسا کہا کہ عائشہ ایک دم چپ اور شانت ہو کر ہوائی جہاز کی کھڑکی سے باہر نیچے زمین پر سبزے کے قالینوں، سفید موتی مالاؤں جیسے ندی نالوں اور شاہراہوں اور کھلونوں جیسی موٹروں، بسوں اور ٹرکوں کو حیرت سے پھٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے شاید یہ سوچنے لگی کہ آدمی بھی عجیب چیز ہے۔ زندگی سے کتنا ہی بیزار اور موت کا کتنا ہی طلب گار ہو مگر جب موت سامنے آجائے تو اس کی گھگھی بندھ جاتی ہے اور وہ موت سے بچنے کے لئے پھر زندگی کی پیٹھ کے پیچھے چھپنے کی کوشس کرنے لگتا ہے۔

بے چاری عائشہ دنیا کے اُن لاکھوں کروڑوں مجبور اور مظلوم انسانوں میں سے ایک تھی جو اس دنیا میں اپنی پیدائش سے لے کر موت تک نہ تو زندگی چاہتے ہیں اور نہ موت!

زندگی سے بھی بیزار۔

اور موت سے بھی خوف زدہ۔

کراچی سے دہلی، دہلی سے ڈھاکہ، ڈھاکہ سے ٹوکیو، ٹوکیو سے واشنگٹن اور واشنگٹن سے سڈنی تک ساری دنیا کے لاکھوں کروڑوں اربوں کھربوں انسان نہ جینا چاہتے ہیں اور نہ مرنا چاہتے ہیں۔ یہ بدنصیب لوگ جب تک زندہ رہتے ہیں تب تک قبر ہی میں رہتے ہیں۔ سطحِ زمین پر ان کے چھوٹے سے مکانوں کی چار دیواری الٹی قبر ہی کی طرح تو ہوتی ہے، اور جب وہ سچ مچ

مرجاتے ہیں تو ان کی گھر نما قبر سیدھی ہو کر اپنی اصل شکل میں آ کر زمین میں دھنس جاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے قبر بن جاتی ہے۔

عائشہ بنگالن نہ تھی، بہاری تھی۔ پٹنہ شہر کے ایک موٹر مکینک حمود الرحمان کی اکلوتی بیٹی اور ٹیکسی ڈرائیور عبدالواحد کی بیوی۔ جسے کوئی سیاسی عقیدہ یا نظریہ پاکستان سے ڈھاکہ نہیں لے گیا تھا بلکہ اس کا شوہر عبدالواحد لے گیا تھا۔ مرد کی اس دنیا میں عورت کی قومیت بھی مرد کی قومیت کی محتاج ہوتی ہے۔ اس لئے قومیت اور شہریت کے دفتروں کی فائلوں میں عائشہ بھی 'سٹیزن آف پاکستان' بن گئی تھی۔ مگر اس کے محلے تانتی بازار کی ساری بنگالن پڑوسنیں چوبیس سال گزرنے کے باوجود بھی اسے 'عائشہ بہاری' ہی کہا کرتی تھیں۔ حالانکہ عائشہ کی آخری شلوار قمیض پٹنہ شہر میں اس کے ماں باپ کے گھر کی ایک کھونٹی پر لٹکی رہ گی تھی اور اس کے بعد سے وہ ساڑھی ایسی باندھنے لگی تھی کہ بنگالنیں بھی کیا باندھتیں۔ جب بھی وہ کمر تک لمبی زلفیں لہراتی اور خوب کس کر ساڑھی باندھے سودا سلف خریدنے محلے کی بڑی سڑک سے گزرتی تو کریسنٹ جنرل اسٹور کے پنجابی پروپرائٹر چودھری خوشی محمد کے منہ میں بہت سا پانی ڈبڈبا آتا اور وہ عائشہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بے اختیار بول اٹھتا۔

"بھئی بلے بلے ٹور بنگالن دی

ہائے رے سحرِ بنگالہ

اوے عالی جی تیرا بیڑہ غرق

سچ ہی کہیا تو نے کہ

جس نے بنگلہ نار نہ دیکھی وہ نہیں پاکستانی"

لمبے بال، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور ٹپیکل بنگالی ساڑھی کے علاوہ وہ چوبیس سال سے بولتے بولتے بنگلہ زبان بھی ایسی فرفرانے لگی تھی کہ اس کی پڑوسنیں کھسر پھسر میں شرطم شرطیں کرتیں کہ —— "چلو، دس کے بیس ۔۔۔۔۔ عاشو بہاری نہیں ہے، بنگالی کا تخم ہے۔"

مگر چوبیس سال آرام سے ہنستے بولتے اور بالکل بنگالن کی طرح رہتے رہتے اچانک ایک دن عائشہ کو یاد دلایا گیا کہ وہ بنگالن نہیں، بہاری ہے۔ وہ ڈائز آف سوائل نہیں ہے۔ چوبیس سال گزر جانے کے باوجود بھی وہ غیر ملکی ہے۔

بڑی جوشیلی آوازیں پلٹن میدان، ریس کورس، موتی جھیل اور بیت المکرم کے لاؤڈ اسپیکروں سے گونج رہی تھیں۔ نوجوان جوشیلے مقرر غصے اور جوش میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ

اسلام پھر سے تیرہ سو برس پیچھے چلا گیا تھا اور پاکستان بھی تیرہ سو میل دور ہٹ گیا تھا۔ بنگالیوں اور بہاریوں نے ایک دوسرے کے خلاف نیزے چھرے اور ہاکی اسٹکیں اٹھالیں اور دونوں طرف کے سیاسی غنڈوں نے بنگالیوں اور بہاریوں کو قتل کرنا اور دونوں کے گھربار اور عورتوں کے پاک شفاف جسم لوٹنے اور آلودہ کرنے شروع کر دیئے۔ مگر اُس وقت بھی بنگلہ زبان نے تانتی بازار میں اور اردو نے محمد پور میں عائشہ کی جان اور آن دونوں بچالی تھیں۔

اور اب پھر ہوائی جہاز میں بھی بنگلہ زبان کے ایک ہی جملے نے عائشہ کو جیسے پھر سے زندہ رہنے کے لئے راضی کرلیا۔ ایک ایرہوسٹس نے دوسری سے پوچھا ——

''رباب ڈارلنگ ــــــــ تم تو بنگلہ زبان اچھی طرح جانتی ہو۔ اُس بنگلہ جملے کی اردو تو بتاؤ جس نے چیختی چنگھاڑتی بھینس کو ایک دم خاموش کرادیا تھا''

رباب ڈارلنگ نے اُس بنگلہ فقرے کا اردو ترجمہ یہ بتایا تھا۔

''اُس بنگالی جوان نے اس عورت سے صرف اتنا کہا تھا'' زمین پر تو جگہ جگہ موت مانگتی پھرتی تھی۔ اب ہوائی جہاز میں موت ممکن ہے تو اُس سے ڈرنے لگی ہے، حرامزادی۔''

پہلی ایرہوسٹس نے ہوسٹس رباب ڈارلنگ پر اپنا شبہ ظاہر کیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ عورت اِس بنگالی کی بیوی نہیں ہے۔ اور یہ اسے ڈھاکہ سے زبردستی اغوا کرلایا ہے۔ جب ہی تو یہ اس کے ساتھ جانے سے شور مچاتی ہے۔''

نورالمومن، عائشہ کو اغوا کر کے نہیں لے جارہا تھا۔ البتہ اُس کی اجڑی کوکھ کو پھر سے ہری کرنے کا بہت بڑا جھوٹ بول کر اسے ڈھاکہ سے کٹھمنڈو اور وہاں سے کراچی لے جارہا تھا۔

عائشہ، نورالمومن پر بھائی جیسا بھروسہ کرتی تھی کیونکہ وہ تانتی بازار میں مشترکہ دیوار والا پڑوسی تھا۔ اس کی بیوی آمنہ اس کی ہمراز سہیلی تھی۔ دونوں کے شوہر ہمسائے ہونے کے علاوہ ہم پیشہ بھی تھے، یعنی ٹیکسی ڈرائیو تھے۔

محلے کا ایک غنڈہ حسن اللہ، نورالمومن اور آمنہ کی شادی سے بہت پہلے آمنہ پر بُری آنکھ رکھتا تھا اور اس سے شادی کا طلب گار تھا۔ لیکن آمنہ کے باپ نے حسن اللہ کو دھتکار کر آمنہ کو نورالمومن سے بیاہ دیا تھا۔ حسن اللہ کو اس شادی کی بڑی خار تھی اور وہ آمنہ کے جسم کا رس پی جانے کے لئے ہر وقت موقعے کا متلاشی رہتا تھا۔ اسی لئے جب کبھی نورالمومن اور حسن اللہ کا سرِ بازار جھگڑا ہوا تو عائشہ کے شوہر عبدالوحید نے نورل کی طرف سے حسن اللہ کی ہمیشہ پٹائی کی تھی۔

پھر جب بنگلہ اور اردو والوں کا فساد تانتی بازار میں بھی دھم سے کود پڑا تو جیسے آمنہ کا چھینکا عین حسن اللہ کے سر پر ٹوٹا۔ حسن اللہ نے مکتی باہنی کے ایک جوان کے جسم سے زبردستی اُتاری ہوئی وردی خود پہن لی اور ایک بہاری تاجر سے لُوٹی ہوئی جیپ میں اپنے پالتو غنڈوں کے ساتھ نُورل کے گھر چڑھ دوڑا۔ گھر میں اکیلی آمنہ کو مادرزاد ننگی کر کے جیپ پر ڈالنے کے لئے گھر سے باہر لایا تو سامنے مسجد کی محراب سے چھُپ کر دیکھنے والے پیش امام مولوی شمس الحق نے لاحول پڑھتے ہوئے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور تیز تیز دعائیں مانگنے لگا تھا۔

''یا اللہ —— ہم مسلمانوں کو نیک توفیق عطا فرما ——''

''یا اللہ —— ہم پاکستانیوں کو راہ راست پر گامزن کر۔ یا اللہ ——''

''یا اللہ —— اگر یہی سب کچھ دکھانا تھا تو پاکستان کیوں بنایا تھا، مالک ——؟''

''رات کو جب نورالمومن اور عبدالوحید کو آمنہ کے اغوا کی خبر ملی تو عبدالوحید نے بھی صندوق سے اپنا پُرانا چھرا نکال لیا۔ لیکن عائشہ نے صرف اپنے سہاگ کے بچانے کے لئے تعصب کا سہارا لیا۔

''تم کیوں بیچ میں پڑتے ہو رضیہ کے ابا بھولو کہ تم بہاری ہو حسن اللہ بھی بنگالی اور نورل بھی بنگالی۔ وہ لائے اپنی بیوی اپنے دشمن کے پنجے سے چھڑا کر۔ تمہیں کیا پڑی ہے؟''

مگر عبدالوحید اُس وقت بہاری نہیں تھا اور نورل اس کے لئے بنگالی نہیں تھا۔ وہ صرف دوست تھا، صرف پیارا تھا۔ اور دوست کی کوئی قومیت اور پیار کی کوئی جغرافیائی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس لئے عبدالوحید غصّے سے باہر نکل گیا۔

پھر وہی ہوا جس کا عائشہ کو ڈر تھا۔ عائشہ بھی دوڑی دوڑی اپنے شوہر نورل کے پیچھے پیچھے گئی۔ مگر وہ حسن اللہ کے باڑے پر اس وقت پہنچی جب حسن اللہ کے پستول کی گولی اس کے شوہر عبدالوحید کے سینے سے پار ہو چکی تھی اور مشکیں کسے ہوئے نورالمومن کے لمبے لمبے بال پکڑ کر زور زور سے کھینچتے ہوئے، حسن اللہ نشے میں دُھت، نورل سے کہہ رہا تھا۔

''شالا —— پاکستانی فوج کا جاشوش —— تیری آمنہ —— نائیں میری آمنہ نائیں تیری ہی آمنہ کا نچلا دھڑ —— تو ایشی سُندر اُردو بھاشا بولتا ہے —— کہ ہم کو جنت کا مزہ آ گیا ——''

''اس کے آگے عائشہ کچھ نہ سُن سکی تھی۔ کیونکہ بے ہوش ہو کر عبدالوحید کی لاش پر گر پڑی

تھی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس کے پاس زخمی نورل بیٹھا تھا۔ بیچاری کی تیرہ سالہ بیٹی بھی اغوا ہو چکی تھی۔
رضیہ کو نہ پا کر عائشہ نے پہلے تو اپنا سر پیٹ لیا اور اپنے آپ کو ختم کرنا چاہتی تھی کہ نورل بولا۔
''عاشو بہن —— اب تجھے رضیہ کے لیے جینا ہے۔ رضیہ زندہ ہے اور قاضی کبیر الدین کے گھر میں بالکل محفوظ ہے —— چل، آ میرے ساتھ ——''
''قاضی کبیر الدین بہاری تھے۔ مگر بہت بڑے مل مالک ہونے کے علاوہ شیخ مجیب الرحمٰن اور تاج الدین احمد کے اچھے دوست تھے۔ عوامی لیگ کو بڑے بڑے چندے عطیے دیتے تھے۔ اس لئے وہ 'پاکستانی فوج کے جاشوش' نہیں تھے۔ صرف غریب ٹیکسی ڈرائیور عبدالوحید ہی 'پاکستانی فوج کا جاشوش' تھا۔
رضیہ بیٹی کے لئے عاشو اپنے آپ کو سنبھالتی نورل کے ساتھ قاضی کبیر الدین کے گھر جانے کے لئے نکلی۔ نورل نے نہ صرف عائشہ کو زندہ رکھنے کے لئے جھوٹ کہا تھا، وہ دراصل عائشہ سے دل ہی دل میں بڑا شرمندہ تھا کہ اس کی وجہ سے عائشہ کے سر سے سہاگ کی مانگ ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ اور اس کی ممتا بھری کوکھ اُجڑ گئی۔ نورل نہ اس کا سہاگ واپس لا سکتا تھا اور نہ اسے پتہ تھا کہ عائشہ کی اکلوتی نوخیز بیٹی رضیہ کو کون اور کہاں اغوا کر کے لے گیا ہے۔ مگر مظلوم عائشہ بڑی معصومیت کے ساتھ جھوٹے کو گھر پہنچانا چاہتی تھی۔ اور جب نورل ٹال مٹول کرنے لگا تو عائشہ، رضیہ —— رضیہ میری بیٹی۔ میری رجو —— پکارتی سڑک پر قاضی کبیر الدین کی عالی شان کوٹھی کی طرف دوڑنے لگی —— نورل بھی اس کے پیچھے دوڑا۔
''رضیہ —— رضیہ —— رضیہ ——''
مگر کہاں ایک سہاگ لٹی، کوکھ اجڑی، بھوکی بیمار عورت کی باریک نسوانی چیخ اور کہاں لاکھوں کروڑوں جوشیلے مردوں کے گھن گرج دار نعرے ——
''جوائے بنگلہ —— جوائے بنگ بندھو ——''
''امار دیش —— تومار دیش ——''
''بانگلہ دیش —— بانگلہ دیش ——''
''امار نیتا —— تومار نیتا ——''
''شیخ مجیب —— شیخ مجیب ——''
ریس کورس کے لان کے بیچوں بیچ بانگلہ دیش کا پہلا جھنڈا بلند ہوا تھا۔ سارا ڈھاکہ ریس

کورس کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ اور لاؤڈ اسپیکر سے ایک جوشیلے نوجوان لیڈر کی آواز گونج رہی تھی۔

''بانگلہ دیش آج سے ایک آزاد اور سوتنتر دیش ہے۔ اس میں رہنے والے، وہ چاہے بنگالی ہوں یا بہاری، ہندو ہوں یا عیسائی، سب آزاد ہیں۔ آج سے ان سب کو اچھی زندگی ملے گی ——'' مگر اس وقت عائشہ کو اچھی زندگی نہیں صرف رضیہ چاہئے تھی۔ وہ قاضی کبیر الدین کے پھاٹک تک پہنچ گئی، لیکن نورل کے اشارے پر دربان نے اسے روک لیا تھا۔ نورل، عائشہ کو جھوٹی تسلی دے کر خود اندر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اندر سے بہلا پھسلا کر قاضی کبیر الدین کی پھوپھی کو جھوٹ بولنے کے لئے باہر بلایا۔ اس سکھائی پڑھائی بڑھیا نے بھی دروغِ مصلحت آمیز کو راستیِ شرانگیز پر ترجیح دیتے ہوئے عائشہ کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے جھوٹی ڈھارس دی کہ تیری بیٹی قاضی کبیر الدین کے چھوٹے بھائی قاضی بشیر الدین کے بیوی بچوں کے ساتھ حفاظت سے کراچی بھیج دی گئی ہے۔ اور جب نورل نے بھی بیت المکرّم کے مقدس میناروں کی طرف شہادت کی انگلی اٹھا کر پھوپھی کے جھوٹ پر اپنا جھوٹ چسپاں کر دیا تو سیّدوں کی بیٹی عائشہ کو یقین آگیا۔ اور وہ پھوپھی کے مشورے پر نورل کے ساتھ کراچی جانے پر آمادہ ہوگئی۔

دلوں کا حال کون جانے —— نورل سچ مچ عائشہ کا بھائی بن گیا تھا یا پھر وہ عائشہ کو اس لئے پاکستان لے جارہا تھا کہ حسن اللہ اسے ڈھاکہ میں جینے نہ دے گا، عائشہ کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ یا شاید یہ بھی کہ اگر پاکستان میں اسے ٹیکسی چلانے کو نہ ملی تو یہ ٹیکسی سہی۔ آدمی پر تین وقت کا فاقہ ہو تو سُور بھی حلال ہوجاتا ہے۔ اور سُور ایسا جانور ہے جس میں جنسی شرم و حیا نام کو بھی نہیں ہوتی۔ واللہ عالم —— نُورل کے دل کا حال نورل ہی جانے۔ البتہ وہ آمنہ کے زیور اور بچا کچھا سارا روپیہ لے کر رضیہ بیٹی کے مقناطیس سے عائشہ کو کھینچتا کھینچتا ڈھاکہ سے کلکتہ اور کلکتے سے کٹھمنڈو پہنچ گیا۔ اور کٹھمنڈو سے پی آئی اے ان دونوں کو لے کر کراچی کی طرف اڑ گیا۔ اس ہجرت میں کوئی سیاسی عقیدہ یا نظریۂ پاکستان عائشہ کو مغربی پاکستان نہیں لے جارہا تھا، بلکہ اس دنیا میں اس کا واحد ہمدرد مرد نُورل اسے نئی زندگی دلانے وہاں لے جارہا تھا۔ پہلی ہجرت میں جب عائشہ مشرقی پاکستان جارہی تھی تو کسی نے پوچھا تھا۔

''تم مشرقی پاکستان کیوں جارہی ہو ——؟''

''عائشہ بلکہ لاکھوں عائشاؤں نے یہی ایک جواب دیا تھا۔ ''رجّو کے ابّا سے پوچھو۔''

''اب پھر چھبیس سال بعد پھر ایک اور ہجرت اور پھر وہی سوال ——؟''

''مغربی پاکستان کیوں جارہی ہو——؟''

جواب بھی وہی۔

''نورل سے پوچھو۔''

مغربی پاکستان جانے سے زیادہ عائشہ بے چاری کا علم وفکر سے عاری ذہن یہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت ہوائی جہاز میں بیٹھی ہے۔ بس اس سے آگے کچھ نہیں۔

عائشہ تو ریل میں بھی صرف ایک بار بیٹھی تھی۔

پہلی ہجرت کے وقت جب ۱۹۴۷ کے فسادات میں پٹنہ شہر سے بھی امیر مسلمان، ان کے اہل وعیال، نوکر چاکر حتیٰ کہ داشتائیں تک ہوائی جہازوں کے ذریعہ صحیح سلامت پاکستان کی طرف اڑ گئے اور عبدالوحید اور عائشہ جیسے غریب مسلمان ٹیکسی ڈرائیور، چھوٹے دوکان دار، لوہار، چمار، باربر، دھوبی، مستری وغیرہ محنت کش لٹتے کٹتے، چھپتے چھپاتے، دھکے کھاتے، کھچا کھچ بھری ہوئی ریل گاڑیوں میں ٹھُس ٹھُساتے مشرقی اور مغربی پاکستان کی طرف رینگ رہے تھے۔ ایک ایسی ہی ٹرین میں عائشہ اور اس کا شوہر عبدالوحید بھی سینڈوچز کی طرح ٹھُسنے ہوئے تھے اور عبدالوحید اپنی حاملہ بیوی کو تسلی دے رہا تھا۔

''بس اب ڈھاکہ پہنچنے کی دیر ہے عاشو، پھر ہمیں نئی زندگی ملے گی۔ قائدِ اعظم نے کہا ہے کہ پاکستان صرف غریب مسلمانوں کی خوش حالی کے لئے بنایا گیا ہے۔ اب پاکستان میں کوئی مسلمان غریب یا تنگ دست نہیں ہوگا۔ وہاں ڈھاکہ میں ہمارا ذاتی مکان ہوگا۔ جہاں سے پٹنہ کے مالک گھنشیام داس کی طرح کوئی دوسرا سنگ دل ظالم بنیا ہمیں اپنے مکان سے کھینچ نہیں نکال سکے گا۔''

☆

اب پھر عائشہ کی دوسری ہجرت تھی —— آخری ہجرت نہیں۔

کیونکہ دنیا میں غریب آدمی کی آخری ہجرت کا کوئی ٹھیک سے پتہ نہیں ہوتا۔ یا پھر اس کی آخری ہجرت آسمانوں کی طرف ہی ہوتی ہے ——!

پہلی ہجرت میں عائشہ ٹرین کے ڈبے میں پھنسی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ اس کا خاوند عبدالوحید بیٹھا ہوا اُس کی جاگتی آنکھوں کے سامنے مشرقی پاکستان کے ڈھاکہ شہر میں ایک نئی اور خوش حال زندگی کے دل فریب تانے بانے بُن رہا تھا۔

اب دوسری ہجرت میں عائشہ ہوائی جہاز میں بیٹھی تھی اور اب کے اس کے شوہر کے بجائے اس کا ہونے والا شوہر یا پھر سچ مچ کا منہ بولا بھائی نور المومن بیٹھا اُس کی جاگتی آنکھوں کے سامنے مغربی پاکستان کے کراچی شہر میں ایک نئی اور نہایت خوش حال زندگی کے دل فریب تانے بانے بن رہا تھا۔

نورل بھی عائشہ کو بالکل عبدالوحید جیسی ہی تسلیاں دے رہا تھا۔

"بس اب کراچی پہنچنے کی دیر ہے، عاشو۔ تجھے وہاں تیری رضیہ بیٹی بھی ملے گی اور سچ مچ کی نئی زندگی بھی۔ قائدِ اعظم نے کہا تھا کہ پاکستان صرف غریب مسلمانوں کی خوش حالی کے لئے بنایا گیا ہے۔ اب پاکستان میں کوئی مسلمان بھی غریب یا تنگ دست نہیں ہوگا۔ وہاں کراچی میں ہمارا ذاتی مکان ہوگا، جہاں سے حسن اللہ جیسا کوئی غنڈہ بدمعاش ہمیں بے دخل نہ کر سکے گا۔ پاکستان سے آئے ہوئے بہت سے بنگالی خانساموں نے مجھے بتایا ہے کہ وہاں پاکستان میں کوئی غریب آدمی نہیں ہے۔ سب امیر کھاتا پیتا لوگ ہے۔ سارا دنیا کا غریب لوگ تو سالا ادھر اپنے بنگال میں رہتا ہے۔ فکر نہ کر۔ کراچی پہنچتے ہی رضیہ بھی ملے گی اور اچھی زندگی بھی۔"

عائشہ جیسے خواب میں بڑبڑا رہی تھی۔ "رضیہ کا ابو بھی یہی بولتا تھا نورل ——"

پھر کچھ سوچ کر عائشہ نے نورل سے پوچھا۔

"نُورل —— قاضی بشیر الدین میری رضیہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر وہ اپنے بھائی قاضی کبیر الدین کو پاکستان کیوں نہیں لے گیا ——؟"

نُورل اس غیر متوقع سوال سے ایک دم سٹپٹا گیا۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔

"اری مورکھ —— قاضی کبیر الدین ڈھاکہ میں اتنے بہت سے دوکان، جوٹ مل، سنیما، پیٹرول پمپ اور امپورٹ ایکسپورٹ چھوڑ کر کراچی کیسے جا سکتا تھا —— اتنا پراپرٹی اور اتنا پیسہ والا آدمی ڈھاکہ نہیں چھوڑ سکتا۔ اور وہ تو اپنے شیخ مجیب اور تاج الدین احمد کا بڑا گہرا دوست ہے۔ عوامی لیگ کو بہت چندہ دیا ہے۔ اس لئے شیخ صاحب سے اجازت لے کر اپنے بھائی بشیر کو پاکستان بھجوا دیا۔ قاضی بشیر کا ڈرائیور ہم کو بولتا تھا کہ پاکستان میں بھی قاضی بشیر احمد خُوب سیٹ ہو گیا ہے۔ جیسا اس کا بھائی قاضی کبیر بانگلہ دیش میں سیٹ ہے۔ کراچی میں بہت بڑا بنگلہ ہے۔ کوئی مل بھی لگا لیا ہے شاید، پیٹرول پمپ بھی ہے۔ میں تو وہاں پاکستان میں قاضی بشیر ہی کوٹھی پر ڈرائیوری کروں گا۔"

عائشہ نے ویسے ہی ایک اندیشہ ظاہر کیا۔

''نُورل —— اگر کراچی میں قاضی بشیر کا بنگلہ نہ ملا تو ہم وہاں کہاں رہیں گے؟''

نُورل کے پاس اس سوال کا فوری کوئی جواب نہ تھا اس لئے ٹالنے کے لئے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے نیچے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو عاشو —— اولا (اللہ) میاں کا کتنا زمین نیچے خالی پڑا ہے۔ ادھر سالا ہم غریبوں کو ایک کمرہ کھولی بنانے کا زمین بھی نہیں ملتا۔ صرف سالا دو گز زمین قبر کے لئے فری ملتا ہے۔ اور اُدھر امیر لوگ کو —— بنگلہ دیش میں قاضی کبیر کو بڑا بنگلہ، تو اُدھر پاکستان میں قاضی بشیر کو بڑا بنگلہ۔ ہونہہ گورنمنٹ بولتا ہے زمین بالکل نہیں ہے۔ نیچے دیکھ کتنا زمین خالی پڑا ہے۔''

''ہوائی جہاز میں اُڑ کر زمین کو دیکھو تو سچ مچ بہت بڑی زمین خالی نظر آتی ہے۔ ابھی کروڑوں اربوں انسان اس خالی زمین پر آباد کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن بے چارے نُورل کو کیا پتہ کہ دنیا کے سارے پیسے والوں نے اس زمین پر اپنی اپنی ملکیت کی سرحدیں کھینچ کھینچ کر ساری زمین آپس میں بانٹ رکھی ہے۔ ساری زمین پانچ براعظموں اور سینکڑوں ملکوں میں بٹی ہوئی ہے۔

وہاں بنگلہ دیش کی زمین ختم ہوئی
وہاں سے بھارت کی زمین پیچھے رہ گئی
اب پاکستان کی زمین شروع ہونے والی ہے
اس کے آگے عربوں کی زمین ہے
اس سے بھی آگے انگریزوں کی زمین ہے
فرانسیسیوں کی زمین ہے
جرمنوں کی زمین ہے
اٹلی والوں کی زمین ہے
رُوسیوں کی زمین ہے
امریکیوں کی زمین ہے
یا پھر یہ زمین دولت خاں کی زمین ہے
یہ زمین کروڑی مل کی زمین ہے
میونسپل کارپوریشن کی زمین ہے

ٹاؤن پلاننگ اتھارٹی کی زمین ہے
گورنمنٹ لینڈ ڈپارٹمنٹ کی زمین ہے
نہ اللہ میاں کی زمین ہے نہ عوام کی زمین
نہ نورل کی زمین نہ عائشہ کی زمین
لینڈ ڈپارٹمنٹ کی زمین ——!!!

عائشہ کی بیٹی، جوان ہوتی ہوئی۔ رضیہ بیرر چک Bearer cheque جیسی رضیہ کو غنڈے ہاتھ سے کیسے جانے دیتے۔ وہ تو رضیہ کو وہیں بنگلہ دیش میں Cash کرا رہے ہوں گے۔ اس لئے رضیہ پاکستان میں عائشہ کو کہاں سے ملتی؟ اور قاضی بشیر کے بُل ٹیریر عائشہ اور نورل کو عالی شان کوٹھی کے پھاٹک میں کیسے گھسنے دیتے۔ البتہ قاضی بشیر کا پرانا وفادار ملازم ابوالہاشم جو قاضی بشیر ہی کے ساتھ بڑے آرام سے ہوائی جہاز میں اڑ کر کراچی آیا تھا، کتوں کے بھونکنے کی آواز پر باہر آیا تو نُورل کو پہچان کر چمٹ گیا۔ کچھ دیر کی باتوں کے بعد ابوالہاشم نے دونوں کو مشورہ دیا کہ قاضی بشیر سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے کہ اپنے ہی جیسے غریب بنگالیوں سے ملا جائے جوان دونوں نووارد مصیبت زدوں کو پناہ دے سکتے ہیں۔ چنانچہ ابوالہاشم نے ان کچھ غریب بنگالیوں کے پتے دیئے۔

''جعفر۔ محمد حُسین، نورالاسلام، سید احمد، شہامت اللہ، ابوالحسنات وغیرہ۔ سب وہاں کنٹری کلب کے قبرستان کے باجو میں فضلو دادا کے باڑے میں اپنی اپنی جھونپڑی ڈال کر رہتے ہیں۔ تُو بھی وہاں اپنی جھونپڑی ڈال لے۔ میں تیری ڈرائیوری کے لیے صاب سے بات کروں گا۔ اسے ایک ڈرائیور کی جرورت تو ہے نہ —— اور تُو تو بھروسے کا اپنا آدمی ہے! اتوار کے اتوار میں بھی فضلو دادا کے باڑے میں آتا ہوں۔ انشا اللہ تیرے لئے خوش خبری لاؤں گا —— تیرے کو اب کچھ پیسہ کی ضرورت ہے تو بول۔''

نُورل نے تشکر کے لہجے میں کہا۔

''ابولہاشم بھائی۔ میرے پاس ابھی کوئی ڈھائی تین سو روپے پاکستانی بچا ہوا ہے۔ اس میں جھونپڑی بھی ڈال لوں گا۔ کچھ کھانے پینے کا برتن چار پائی وغیرہ بھی خرید لوں گا۔ مگر تو میری نوکری کا ضرور کوئی بندوبست کر۔ ورنہ یہ ڈھائی تین سو ٹکا کب تک بیٹھ کر کھا سکوں گا؟''

ابوالہاشم نے عائشہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ہاں! دو جنے کا

ساتھ۔تُو اور تیری۔۔۔"

نورل تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔

"میری بہن —— اپنے وحید کی بیوہ ——

ابوالہاشم نے ایک دم سنبھل کر وحید کو یاد کر کے اور عائشہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

کہا کہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا: "بے چارہ وحید —— !"

نُورل، عائشہ کو ساتھ لے کر جب کنٹری کلب کے قبرستان کے پاس پہنچا۔ عائشہ نے

چپکے سے پڑھ لیا۔"بہاریو —— واپس جاؤ ——"

راستے میں جب وہ قائدِ اعظم کے مزار کے پاس پہنچے تو اس کا سنگ مرمر اور اس کی خوبصورتی دیکھ کر دیر تک کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ وہ جیسے جیسے دور جانے لگے، قائد اعظم کا مزار ان کے ساتھ چلنے لگا اور ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہوا۔

عائشہ نے کچھ پوچھنا چاہا۔"نُورل، قائدِ اعظم نے کہا تھا۔۔۔

نُورل جلدی سے بات کاٹ کر بولا۔"عاشو —— دیکھتی نہیں کہ قائد اعظم کو اس مقبرے میں چُھپا دیا گیا ہے۔ بس چُپ کر۔"

کیا یہ جواب کافی تھا کہ عائشہ مطمئن ہو کر چپ ہو گئی؟؟

☆

کنٹری کلب کے قبرستان سے متصل بنگالی پاڑے کی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ قبرستان سے اس لئے قریب کہ جنازہ اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے۔ جھونپڑی سے نکلے تو قبر میں

—— بلکہ ایک قبر سے نکلے تو دوسری قبر میں ——

قبرستان میں —— سیدھی قبریں۔

بنگالی پاڑے میں —— اُلٹی قبریں۔

فضلو دادا اور بنگالی پاڑے کے سارے باسیوں نے فضلو اور عائشہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پاڑے میں ابھی ایک جھونپڑی —— یا ایک الٹی قبر کی جگہ باقی تھی۔ نُورل، شہامت اللہ کے ساتھ جا کر لالو کھیت مارکیٹ سے جھونپڑی ڈالنے کے لئے بانس، چٹائی چھپرا، دو چار پائیاں، کچھ المونیم کے برتن، ایک لالٹین، ٹین کا چولہا اور آٹا چاول وغیرہ لے آیا۔ شام تک جھونپڑی بھی ڈال لی اور بڑا خوش تھا کہ وہ پھر ایک بار نئی زندگی شروع کر رہا ہے۔

مگر سرِ شام دو سنڈے مسٹنڈے کارندے آگئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو گورنمنٹ لینڈ ڈپارٹمنٹ کا بابو ظاہر کیا۔ پھر ایک بابو، نورل کو دھکے ٹھڈے مارتا تھانے کی طرف لے گیا کہ اس نے گورنمنٹ کی زمین پر ناجائز قبضہ کیا ہے اور دوسرا بابو جھونپڑی میں لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا اور گورنمنٹ کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنے کے جرم کی سزا دینے کے لئے عائشہ کے جسم کی زمین پر خود نے ناجائز قبضہ کرنا شروع کردیا۔

بے چاری عائشہ کی چیخیں سُن کر جھونپڑیوں کی عورتوں نے مارے شرم کے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ دو ایک مردوں کا خون کھولا تو ان کی بیویاں ان کے آگے ہاتھ جوڑنے لگیں۔

''عائشہ تو بیوہ ہے ہی۔ ہمیں کیوں بیوہ کرنے چلے ہو؟''

یہ التجا سن کر غیرت اور مردانگی کے قدم بھی لڑکھڑا کر رہ گئے۔

صبح ہوئی تو فضلو دادا اور سارے جھونپڑوں والوں نے عائشہ کی جھونپڑی میں جھانک کر دیکھا عائشہ فرش پر مادر زاد ننگی پڑی تھی۔ سب عائشہ کی آبرو کو پس مرگ ڈھانکنے کے لئے جھوٹ بولنے لگے۔ ''ہے ہے، بے چاری عائشہ کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔''

عائشہ کو واقعی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ کیونکہ 'سانپ' اپنا انڈر ویر' وہیں بھول گیا تھا۔ وہ عجب سانپ تھا۔ سانپ تو 'اوور ویر' یعنی کینچلی پہنتے ہیں۔ یہ کیسا سانپ تھا جو انڈر ویر پہنتا تھا ——!

بالآخر فضلو دادا نے اپنے سارے چیلوں کو حکم دیا۔ ''عائشہ کی جھونپڑی الٹا دو ——''

سب نے مل کر عائشہ کی جھونپڑی کو اس طرح الٹا دیا کہ وہ اُلٹی جھونپڑی بالکل سیدھی قبر کی طرح زمین میں دھنس گئی ——

جب سب لوگ اس پر مٹی ڈالنے لگے تو فضلو دادا نے بھی ایک مٹھی بھر مٹی لے کر بڑے جلتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہاں پٹنہ، کہاں ڈھاکہ، کہاں کٹھمنڈو ——''

''بے چاری کی مٹی اسے یہاں کھینچ لائی تھی ——''

فضلو دادا ٹھیک ہی کہتا ہے —— عائشہ جیسے غریبوں کو صرف مٹی ہی کھینچ لاتی ہے — ان بے چاروں کو کوئی سنگ مرمر تو نہیں کھینچ لاتا ——!

☆☆☆

(مجموعہ: اُلٹی قبر، کراچی، ۱۹۷۸)